تفہیم القرآن

القصص

(۳)

جب موسیٰ نے مدت پوری کردی[۲۳] اور وہ اپنے اہل وعیال کو لیکر چلا[۲۴] تو طور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھروالوں سے کہا "ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھالاؤں جس سے تم تاپ سکو۔" وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے[۲۵] پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ "اے موسیٰ، میں ہی اللہ ہوں، سارے جہان

۲۳؎ حضرت حسن بن علی بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے آٹھ کے بجائے دس سال کی مدت پوری کی تھی۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ یہ بات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا قضیٰ موسیٰ اتم الاجلین واطیبھما عشر سنین "موسیٰ علیہ السلام نے دونوں مدتوں میں سے وہ مدت پوری کی جو زیادہ کامل اور ان کے خسر کے لیے زیادہ خوشگوار تھی یعنی دس سال۔"

۲۴؎ اس سفر کا رخ طور کی جانب ہونے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے اہل وعیال کو لیکر مصر ہی جانا چاہتے ہونگے۔ اس لیے کہ طور اس راستے پر ہے جو مدین سے مصر کی طرف جاتا ہے۔ غالباً حضرت موسیٰ نے خیال کیا ہوگا کہ دس سال گزر چکے ہیں۔ وہ فرعون بھی مرچکا ہے جس کی حکومت کے زمانے میں وہ مصر سے نکلے تھے۔ اب اگر خاموشی کے ساتھ وہاں چلا جاؤں اور اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہ پڑوں تو شاید کسی کو میرا پتہ بھی نہ چلے۔

بائیبل کا بیان یہاں واقعات کی ترتیب میں قرآن کے بیان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے خسر کی بکریاں چراتے ہوئے "بیابان کے پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک" آنکلے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا اور انہیں رسالت کے منصب پر مامور کرکے مصر جانے کا حکم دیا۔ پھر وہ اپنے خسر کے

© rasailojaraid.com

والوں کا مالک[۲۶]" اور (حکم دیا گیا کہ) پھینک دے اپنی لاٹھی۔ جونہی کہ موسیٰ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہوا) "موسیٰ، پلٹ آ اور خوف نہ کر، تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے[۲۷]۔ اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھینچ لے[۲۸]۔ یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے

پاس واپس آگئے اور ان سے اجازت لیکر اپنے بال بچوں کے ساتھ مصر روانہ ہوئے (خروج ۴: ۱۔ ۱۸)۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ مدت پوری کرنے کے بعد اپنے اہل وعیال کو لیکر مدین روانہ ہوئے اور اس سفر میں اللہ تعالیٰ کی مخاطبت اور منصب نبوت پر تقرر کا معاملہ پیش آیا۔

بائیبل اور تلمود، دونوں کا متفقہ بیان ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانۂ قیام مدین میں وہ فرعون مرچکا تھا جس کے ہاں انہوں نے پرورش پائی تھی اور اب ایک دوسرا فرعون مصر کا فرمانروا تھا۔

۲۵ یعنی اس کنارے پر جو حضرت موسیٰ کے داہنے ہاتھ کی طرف تھا۔

۲۶ یعنی اس خطے میں جو نور تجلی سے روشن ہو رہا تھا۔

۲۷ یہ دونوں معجزے اس وقت حضرت موسیٰ کو اس لیے دکھائے گئے کہ اول تو انہیں خود پوری طرح یقین ہو جائے کہ فی الواقع وہی ہستی ان سے مخاطب ہے جو کائنات کے پورے نظام کی خالق و مالک اور فرمانروا ہے، دوسرے وہ ان معجزوں کو دیکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ جس خطرناک مشن پر انہیں فرعون کی طرف بھیجا جا رہا ہے اس کا سامنا کرنے کے لیے وہ بالکل نہتے نہیں جائیں گے بلکہ دو زبردست ہتھیار لیکر جائیں گے۔

۲۸ یعنی جب کبھی کوئی خطرناک موقع ایسا آئے جس سے تمہارے دل میں خوف پیدا ہو تو اپنا بازو بھینچ لیا کرو اس سے تمہارا دل قوی ہو جائے گا اور رعب و دہشت کی کوئی کیفیت تمہارے اندر باقی نہ رہے گی۔

بازو سے مراد غالباً سیدھا بازو ہے، کیونکہ مطلقاً ہاتھ بول کر سیدھا ہاتھ ہی مراد لیا جاتا ہے۔ بھینچنے کی دو شکلیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ بازو کو پہلو کے ساتھ لگا کر دبا لیا جائے۔ دوسری یہ کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی بغل میں رکھ کر دبایا جائے۔ اغلب یہ ہے کہ پہلی شکل ہی مراد ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں دوسرا کوئی شخص یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ آدمی اپنے دل کا خوف دور کرنے کے لیے کوئی خاص عمل کر رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

سامنے پیش کرنے کے لیے، وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں"[۲۹] موسیٰ نے عرض کیا "میرے آقا، میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے[۳۰] اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے" فرمایا "ہم تیرے بھائی کے ذریعہ سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سطوت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہوگا[۳۱]

حضرت موسیٰ کو یہ تدبیر اس لیے بتائی گئی کہ وہ ایک ظالم حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی لاؤ لشکر اور دنیوی ساز و سامان کے بغیر بھیجے جا رہے تھے۔ بارہا ایسے خوفناک مواقع پیش آنے والے تھے جن میں ایک اولوالعزم نبی تک دہشت سے محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کوئی ایسی صورت پیش آئے، تم بس یہ عمل کر لیا کرو، فرعون اپنی پوری سلطنت کا زور لگا کر بھی تمہارے دل کی طاقت کو متزلزل نہ کر سکے گا۔

۲۹؎ ان الفاظ میں یہ مفہوم آپ سے آپ شامل ہے کہ یہ نشانیاں لیکر فرعون کے پاس جاؤ اور اللہ کے رسول کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کر کے اسے اور اس کے اعیانِ سلطنت کو اللہ رب العٰلمین کی اطاعت و بندگی کی طرف دعوت دو۔ اسی لیے یہاں اس ماموریت کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ البتہ دوسرے مقامات پر صراحت کے ساتھ یہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ نازعات میں فرمایا اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى "فرعون کے پاس جا کہ وہ سرکش ہو گیا ہے" اور الشعراء میں فرمایا اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ "جب کہ پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا ظالم قوم کے پاس، فرعون کی قوم کے پاس"۔

۳۰؎ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس ڈر سے میں وہاں نہیں جانا چاہتا بلکہ مطلب یہ تھا کہ حضور کی طرف سے ایسا کوئی انتظام ہونا چاہیے کہ میرے پہنچتے ہی کسی بات چیت اور ادائے رسالت کی نوبت آنے سے پہلے وہ لوگ مجھے الزامِ قتل میں گرفتار نہ کر لیں، کیونکہ اس صورت میں تو وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے مجھے اس مہم پر بھیجا جا رہا ہے۔ بعد کی عبارت سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ کی اس گزارش کا یہ مدعا ہرگز نہیں تھا کہ وہ ڈر کے مارے نبوت کا منصب قبول کرنے اور فرعون کے ہاں جانے سے انکار کرنا چاہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر جب موسیٰ اُن لوگوں کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لیکر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔(۳۲) اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سُنی ہی نہیں۔(۳۳) موسیٰ نے جواب

(۳۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰ کی اس ملاقات اور گفتگو کا حال اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ طٰہٰ (آیت ۹ تا ۴۸) میں بیان ہوا ہے۔ قرآن مجید کے اس بیان کا جو شخص بھی اس داستان سے مقابلہ کریگا جو اس سلسلہ میں بائیبل کی کتاب خروج (باب ۳، ۴) میں بیان کی گئی ہے۔ وہ اگر کچھ ذوقِ سلیم رکھتا ہو تو خود محسوس کر لیگا کہ ان دونوں میں سے کلامِ الٰہی کونسا ہے اور انسانی داستان گوئی کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ نیز وہ اس معاملہ میں بھی بآسانی رائے قائم کر سکے گا کہ آیا قرآن کی یہ روایت معاذاللہ بائیبل اور اسرائیلی روایات کی نقل ہے، یا وہ خدا خود اصل واقعہ بیان فرما رہا ہے جس نے حضرت موسیٰ کو باریاب فرمایا تھا۔

(۳۲) اصل الفاظ ہیں سِحْرٌ مُّفْتَرًی "افترا کیا ہوا جادو"۔ اس افترا کو اگر جھوٹ کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لاٹھی کا اژدہا بننا اور ہاتھ کا چمک اٹھنا نفسِ شے میں حقیقی تغیر نہیں ہے بلکہ محض ایک نمائشی شعبدہ ہے جسے یہ شخص معجزہ کہہ کر ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔ اور اگر اسے بناوٹ کے معنی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ یہ شخص کسی کرتب سے ایک ایسی چیز بنا لایا ہے جو دیکھنے میں لاٹھی معلوم ہوتی ہے مگر جب یہ اسے پھینک دیتا ہے تو سانپ نظر آنے لگتی ہے۔ اور اپنے ہاتھ پر بھی اس نے کوئی ایسی چیز مل لی ہے کہ اس کی بغل سے نکلنے کے بعد وہ یکایک چمک اٹھتی ہے۔ یہ مصنوعی طلسم اس نے خود تیار کیا ہے، اور ہمیں یقین یہ دلا رہا ہے کہ یہ معجزے ہیں جو خدا نے اسے عطا کیے ہیں۔

(۳۳) اشارہ ہے ان باتوں کی طرف جو تبلیغِ رسالت کے سلسلے میں حضرت موسیٰ نے پیش کی تھیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان باتوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ النازعات میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس سے کہا: هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى "کیا تو پاکیزہ روش اختیار کرنے پر آمادہ ہے؟ اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو خشیت اختیار کریگا؟" سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى "ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لائے ہیں، اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے اور ہم پر وحی کی گئی ہے کہ سزا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا "میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لیکر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہوتا ہے، حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے"۔[۳۴]

اور فرعون نے کہا "اے اہلِ دربار، میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔[۳۵] ہامان! ذرا

اُس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے"۔ اور اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ "ہم رب العلمین کے پیغمبر ہیں اور یہ پیغام لائے ہیں کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے"۔ انہی باتوں کے متعلق فرعون نے کہا کہ ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ فرعونِ مصر سے اوپر بھی کوئی ایسی مقتدر ہستی ہے جو اس کو حکم دینے کی مجاز ہو، جو اسے سزا دے سکتی ہو، جو اسے ہدایات دینے کے لیے کسی آدمی کو اس کے دربار میں بھیجے، اور جس سے ڈرنے کے لیے مصر کے بادشاہ سے کہا جائے۔ یہ تو نرالی باتیں ہیں جو آج ہم ایک شخص کی زبان سے سُن رہے ہیں۔

[۳۴] یعنی تو مجھے ساحر اور افترا پرداز قرار دیتا ہے، لیکن میرا رب میرے حال سے خوب واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو شخص اس کی طرف سے رسول مقرر کیا گیا ہے وہ کیسا آدمی ہے۔ اور آخری انجام کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میں جھوٹا ہوں تو میرا انجام برا ہوگا اور تو جھوٹا ہے تو پھر خوب جان لے کہ تیرا انجام اچھا نہیں ہے۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ظالم کے لیے فلاح نہیں ہے۔ جو شخص خدا کا رسول نہ ہو اور جھوٹ موٹ کا رسول بن کر اپنا کوئی مفاد حاصل کرنا چاہے وہ بھی ظالم ہے اور فلاح سے محروم رہے گا، اور جو طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگا کر سچے رسول کو جھٹلائے اور مکاریوں سے صداقت کو دبانا چاہے تو وہ بھی ظالم ہے اور اسے کبھی فلاح نصیب نہ ہوگی۔

[۳۵] اس قول سے فرعون کا مطلب ظاہر ہے کہ یہ نہیں تھا اور نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہی تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہوں، کیونکہ ایسی بات صرف ایک پاگل ہی کے منہ سے نکل سکتی تھی۔ اور اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، کیونکہ اہلِ مصر کے مذہب میں بہت سے معبودوں کی پرستش ہوتی تھی، اور خود فرعون کو جس بنا پر معبودیت کا مرتبہ دیا گیا تھا وہ بھی صرف یہ تھی کہ اسے سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا۔ سب سے بڑی شہادت قرآن مجید کی موجود ہے کہ فرعون خود بہت سے دیوتاؤں کا پرستار تھا: وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَکَ وَاٰلِهَتَکَ "اور فرعون

© rasailojaraid.com

اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا، شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں، میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔[۳۸] "

کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوٹ دے دیگا کہ ملک میں فساد برپا کریں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں" (الاعراف، رکوع ۱۵)۔ اس لیے لامحالہ یہاں فرعون نے لفظ "خدا" اپنے لیے بمعنی خالق و معبود نہیں بلکہ بمعنی مُطاع و حاکمِ مطلق استعمال کیا تھا۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ اس سرزمینِ مصر کا مالک میں ہوں۔ یہاں میرا حکم چلے گا، میرا ہی قانون یہاں قانون مانا جائے گا۔ میری ذات ہی یہاں امر و نہی کا سرچشمہ تسلیم کی جائے گی۔ کوئی دوسرا یہاں حکم چلانے کا مجاز نہیں ہے۔ یہ موسیٰ کون ہے جو رب العالمین کا نمائندہ بن کر آ کھڑا ہوا ہے اور مجھے اس طرح احکام سنا رہا ہے کہ گویا اصل فرمانروا یہ ہے اور میں اس کا تابعِ فرمان ہوں۔ اسی بنا پر اس نے اپنے دربار کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا تھا یَا قَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ "اے قوم، کیا مصر کی بادشاہی میری ہی نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے تحت جاری نہیں ہیں؟" (الزخرف۔ ۵) اور اسی بنا پر وہ حضرت موسیٰ سے بار بار کہتا تھا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ، "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے ہٹا دے جو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اس ملک میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی ہو جائے؟" (یونس۔ ۸)، اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى۔ "اے موسیٰ کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اپنے جادو کے زور سے ہماری زمین سے بے دخل کر دے؟" (طٰہٰ۔ ۳) اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ "میں ڈرتا ہوں کہ یہ شخص تم لوگوں کا دین بدل ڈالے گا، یا ملک میں فساد برپا کرے گا" (المومن ۳)

اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو فرعون کی پوزیشن اُن ریاستوں کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو خدا کے پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت سے آزاد و خود مختار ہو کر اپنی سیاسی اور قانونی حاکمیت کی مدعی ہیں۔ وہ خواہ سرچشمۂ قانون اور صاحبِ امر و نہی کسی بادشاہ کو مانیں یا قوم کی مرضی کو، بہر حال جب تک وہ یہ موقف اختیار کیے ہوئے ہیں کہ ملک میں خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ ہمارا حکم چلے گا اس وقت تک ان کے اور فرعون کے موقف میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بے شعور لوگ فرعون پر لعنت بھیجتے رہیں اور ان کو سندِ جواز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا[۳۷] اور سمجھے کہ انہیں

عطا کرتے رہیں۔ حقائق کی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی تو معنی اور روح کو دیکھے گا نہ کہ الفاظ اور اصطلاحات کو۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون نے اپنے لیے "الٰہ" کا لفظ استعمال کیا تھا، اور یہ اسی معنی میں "حاکمیت" کی اصطلاح استعمال کرتی ہیں۔

۳۶ے یہ اسی قسم کی ذہنیت تھی جیسی موجودہ زمانے کے روسی کمیونسٹ ظاہر کر رہے ہیں۔ یہ اسپٹنک اور لونک چھوڑ کر دنیا کو خبر دیتے ہیں کہ ہماری ان گیندوں کو اوپر کہیں خدا نہیں ملا۔ وہ بے وقوف ایک مینار سے پر چڑھ کر خدا کو جھانکنا چاہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گمراہ لوگوں کے ذہن کی پرواز ساڑھے تین ہزار برس پہلے جہاں تک تھی آج بھی وہیں تک ہے۔ اس اعتبار سے ایک انگل بھر ترقی بھی وہ نہیں کر سکے ہیں۔ معلوم نہیں کس احمق نے ان کو یہ خبر دی تھی کہ خدا پرست لوگ جس رب العالمین کو مانتے ہیں وہ ان کے عقیدے کی رو سے، اوپر کہیں بیٹھا ہوا ہے، اور اس انتھاہ کائنات میں زمین سے چند ہزار فیٹ یا چند لاکھ میل اوپر اُٹھ کر اگر وہ انہیں نہ ملے تو یہ بات گویا بالکل ثابت ہو جائے گی کہ وہ کہیں موجود نہیں ہے۔

قرآن یہاں یہ نہیں کہتا کہ فرعون نے فی الواقع ایک عمارت اس غرض کے لیے بنوائی تھی اور اس پر چڑھ کر خدا کو جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ بلکہ وہ اُس کے صرف اس قول کو نقل کرتا ہے۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عملاً یہ حماقت نہیں کی تھی۔ اِن باتوں سے اس کا مدعا صرف بے وقوف بنانا تھا۔

یہ امر بھی واضح طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ فرعون آیا فی الواقع خداوندِ عالم کی ہستی کا منکر تھا یا محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر دہریت کی باتیں کرتا تھا۔ اس کے اقوال اِس معاملہ میں اُسی ذہنی الجھاؤ کی نشان دہی کرتے ہیں جو روسی کمیونسٹوں کی باتوں میں پایا جاتا ہے۔ کبھی تو وہ آسمان پر چڑھ کر دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ میں اوپر دیکھ آیا ہوں، موسیٰ کا خدا کہیں نہیں ہے۔ اور کبھی وہ کہتا فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ "اگر موسیٰ واقعی خدا کا بھیجا ہوا ہے تو کیوں نہ اُس کے لیے سونے کے کنگن اتارے گئے، یا اس کی اردلی میں ملائکہ نہ آئے"؟ یہ باتیں روس کے وزیر اعظم خروشچیف کی باتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں جو کبھی خدا کا انکار کرتا ہے اور کبھی بار بار خدا کا نام لیتا ہے۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔[۳۸] آخرکار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔[۳۹] اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ ہم نے انہیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا[۴۰] اور قیامت کے روز وہ کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔ ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا

اور ان کے خلفاء کا دورِ اقتدار گزر جانے کے بعد جب مصر میں قبطی قوم پرستی کا زور ہوا اور ملک میں اسی نسلی و وطنی تعصب کی بنیاد پر سیاسی انقلاب رونما ہو گیا تو نئے لیڈروں نے اپنے قوم پرستانہ جوش میں اُس خدا کے خلاف بھی بغاوت کر دی جس کو ماننے کی دعوت حضرت یوسفؑ اور ان کے پیرو اسرائیلی اور مصری مسلمان دیتے تھے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ خدا کو مان کر ہم یوسفی تہذیب کے اثر سے نہ نکل سکیں گے، اور یہ تہذیب باقی رہی تو ہمارا سیاسی اثر بھی مستحکم نہ ہو سکے گا۔ وہ خدا کے اقرار اور مسلم اقتدار کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے، اس لیے ایک سے پیچھا چھڑانے کی خاطر دوسرے کا انکار ان کے نزدیک ضروری تھا، اگرچہ اس کا اقرار ان کے دل کی گہرائیوں سے کسی طرح نکالے نہ نکلتا تھا۔

۳۷ یعنی بڑائی کا حق تو اِس کائنات میں صرف اللہ رب العالمین کو ہے۔ مگر فرعون اور اس کے لشکر زمین کے ایک ذرا سے خطے میں تھوڑا سا اقتدار پا کر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہاں بڑے بس وہی ہیں۔

۳۸ یعنی انہوں نے اپنے آپ کو غیر مسئول سمجھ لیا اور یہ فرض کر کے خود مختارانہ کام کرنے لگے کہ انہیں جا کر کسی کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی ہے۔

۳۹ اِن الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے تکبر کے مقابلے میں ان کی بے حقیقتی اور ہیچ میرزی کی تصویر کھینچ دی ہے وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھ بیٹھے تھے۔ مگر جب وہ مہلت جو خدا نے ان کو راہ راست پر آنے کے لیے دی تھی ختم ہو گئی تو انہیں اس طرح اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا جیسے کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

۴۰ یعنی وہ بعد کی نسلوں کے لیے ایک مثال قائم کر گئے ہیں کہ ظلم یوں کیا جاتا ہے، انکارِ حق پر ڈٹ جانے اور آخر وقت تک ڈٹے رہنے کی شان یہ ہوتی ہے، اور صداقت کے مقابلے میں باطل پر لوگ ایسے ایسے ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ سب راستے دنیا کو دکھا کر وہ جہنم کی طرف جا چکے ہیں اور ان کے اخلاف اب انہی کے نقشِ قدم پر چل کر اسی منزل کے رُخ لپکے جا رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ع ۴ دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہونگے [۴۱]

پچھلی نسلوں کو ہلاک کر دینے کے بعد ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی، لوگوں کے لیے بصیرتوں کا سامان بنا کر، ہدایت اور رحمت بنا کر، تاکہ لوگ سبق حاصل کریں[۴۲]۔ (اے محمدؐ) تم اُس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے[۴۳] جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا، اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے[۴۴]، بلکہ اس کے بعد (تمہارے زمانے تک) ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے[۴۵]۔ تم اہلِ مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ اُن کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے[۴۶]، مگر (اُس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور

---

[۴۱] اصل الفاظ ہیں قیامت کے روز وہ "مقبوحین" میں سے ہونگے۔ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ وہ مردود و مطرود ہونگے۔ اللہ کی رحمت سے بالکل محروم کر دیئے جائیں گے۔ ان کی بری گت بنائی جائے گی اور ان کے چہرے بگاڑ دیئے جائیں گے۔

[۴۲] یعنی پچھلی نسلیں جب انبیائے سابقین کی تعلیمات سے روگردانی کا بُرا نتیجہ بھگت چکیں، اور ان کا آخری انجام وہ کچھ ہو چکا جو فرعون اور اس کے لشکروں نے دیکھا، تو اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی گئی تاکہ انسانیت کا ایک نیا دور شروع ہو۔

[۴۳] مغربی گوشے سے مراد جزیرہ نمائے سینا کا وہ پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰ کو احکام شریعت دیئے گئے تھے۔ یہ علاقہ حجاز کے مغربی جانب واقع ہے۔

[۴۴] یعنی بنی اسرائیل کے اُن ستّر نمائندوں میں جن کو شریعت کی پابندی کا عہد لینے کے لیے حضرت موسیٰ کے ساتھ بلایا گیا تھا۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۵۵ میں ان نمائندوں کے بلائے جانے کا ذکر گزر چکا ہے، اور بائیبل کی کتاب خروج، باب ۲۴ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے)۔

[۴۵] یعنی تمہارے پاس اِن معلومات کے حصول کا براہِ راست کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آج جو تم ان واقعات کو دو ہزار برس سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد اس طرح بیان کر رہے ہو کہ گویا یہ سب تمہارا آنکھوں دیکھا حال ہے، اِس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے تم کو یہ معلومات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔

[۴۶] یعنی جب حضرت موسیٰ مدین پہنچے، اور جو کچھ وہاں ان کے ساتھ پیش آیا، اور دس سال گزار کر جب وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تم طور کے دامن میں بھی اُس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ کو پہلی مرتبہ) پکارا تھا، مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں)[۶۶] تاکہ تم ان لوگوں کو متنبہ کرو جن کے پاس تم سے

وہاں سے روانہ ہوئے، اس وقت تمہارا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ تم اُس وقت مدین کی بستیوں میں وہ کام نہیں کر رہے تھے جو آج مکہ کی گلیوں میں کر رہے ہو۔ اُن واقعات کا ذکر تم کچھ اس بنا پر نہیں کر رہے ہو کہ یہ تمہارا عینی مشاہدہ ہے، بلکہ یہ علم بھی تم کو ہماری وحی کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوا ہے۔

[۶۷] یہ تینوں باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جس وقت یہ باتیں کہی گئی تھیں اُس وقت مکہ کے تمام سردار اور عام کفار اس بات پر پوری طرح تُلے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کو غیر نبی اور معاذ اللہ جھوٹا مدعی ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہود کے علماء اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی بستیوں میں موجود تھے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں عالمِ بالا سے آکر یہ قرآن نہیں سنا جاتے تھے، بلکہ اسی مکہ کے رہنے والے تھے اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپ کی بستی اور آپ کے قبیلے کے لوگوں سے چھپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اس کھلے چیلنج کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تین باتیں ارشاد فرمائی گئیں، اس وقت مکے، اور حجاز، اور پورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اٹھ کر وہ بیہودہ بات نہ کہہ سکا، جو آج کے مستشرقین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹ گھڑنے میں وہ لوگ اِن سے کچھ کم نہ تھے، لیکن ایسا دروغ بے فروغ آخر وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ، تم فلاں فلاں یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کر لائے ہو، کیونکہ پورے ملک میں وہ اِس غرض کے لیے کسی کا نام نہیں لے سکتے تھے جس کا نام بھی وہ لیتے، فوراً ہی یہ ثابت ہو جاتا کہ اس سے آنحضرتؐ نے کوئی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ، تمہارے پاس پچھلی تاریخ اور علوم و آداب کی ایک لائبریری موجود ہے جس کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو درکنار، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کہیں سے وہ کاغذ کا ایک پرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہوئی ہوں۔ مکے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں، اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو عبرانی اور سریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے آپ کو دیتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہوش میں آئیں۔ (اور یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ

پھر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا بے حیا آدمی بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا کہ شام و فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپ یہ معلومات حاصل کر آئے تھے۔ کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوتے تھے۔ مکے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اُس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سینکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی رومیوں سے مسلمان برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔ اگر کہیں جھوٹوں بھی شام و فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہودی ربّی سے حضورؐ نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو رومی سلطنت رائی کا پہاڑ بنا کر یہ پروپیگنڈا کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ محمدؐ، معاذاللہ سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مکے جا کر نبی بن بیٹھے۔ غرض، اُس زمانے میں جبکہ قرآن کا یہ چیلنج قریش کے کفار و مشرکین کے لیے پیامِ موت کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کو جھٹلانے کی ضرورت موجودہ زمانے کے مستشرقین کی بہ نسبت اُن لوگوں کو بدرجہا زیادہ لاحق تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لا سکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا ان معلومات کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشاندہی کی جا سکتی ہو۔

یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن نے یہ چیلنج اسی ایک جگہ نہیں دیا ہے بلکہ متعدد مقامات پر مختلف قصوں کے سلسلے میں دیا ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت مریم کا قصہ بیان کر کے فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ "یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعہ سے تمہیں دے رہے ہیں، تم اُن لوگوں کے آس پاس کہیں موجود نہ تھے جبکہ وہ اپنے قرعے یہ طے کرنے کے لیے پھینک رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے۔ اور نہ تم اس وقت موجود تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے" (آل عمران، رکوع ۵)۔ حضرت یوسفؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ "یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعہ سے تمہیں دے رہے ہیں، تم ان کے (یعنی یوسف کے بھائیوں کے) آس پاس کہیں موجود نہ تھے جبکہ انہوں نے اپنی تدبیر پر اتفاق کیا اور جب کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے اپنے کیے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب اُن پر آئے تو وہ کہیں "اسے پروردگار، تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہلِ ایمان میں سے ہوتے۔"۴۹

اپنی چال چل رہے تھے" (یوسف۔ رکوع ۱۱)۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کا مفصل قصہ بیان کرکے فرمایا تِلْكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْھَا اِلَیْكَ، مَا كُنْتَ تَعْلَمُھَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ ھٰذَا "یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں، تمہیں اور تمہاری قوم کو اس سے پہلے ان کا کوئی علم نہ تھا" (ہود: ۴)۔ اس چیز کی بار بار تکرار سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن مجید اپنے من جانب اللہ ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے پر جو بڑے بڑے دلائل دیتا تھا ان میں سے ایک یہ دلیل تھی کہ سینکڑوں ہزاروں برس پہلے کے گزرے ہوئے واقعات کی جو تفصیلات ایک اُمّی کی زبان سے بیان ہو رہی ہیں ان کے علم کا کوئی ذریعہ اُس کے پاس وحی کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ چیز اُن اہم اسباب میں سے ایک تھی جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر لوگ اس بات پر یقین لاتے چلے جا رہے تھے کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں اور آپ پر وحی آتی ہے۔ اب یہ ہر شخص خود تصور کر سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کے مخالفین کے لیے اس زمانے میں اس چیلنج کی تردید کرنا کیسی کچھ اہمیت رکھتا ہوگا، اور انہوں نے اس کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کی کوششوں میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی۔

۴۸؎ عرب میں حضرت اسمٰعیل اور حضرت شعیب علیہما السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ تقریباً دو ہزار برس کی اس طویل مدت میں باہر کے انبیاء کی دعوتیں تو وہاں ضرور پہنچیں، مثلاً حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی دعوتیں، مگر کسی نبی کی بعثتِ خاص اس سرزمین میں نہیں ہوئی۔

۴۹؎ اسی چیز کو قرآن مجید متعدد مقامات پر رسولوں کے بھیجے جانے کی وجہ کے طور پر پیش کرتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اس غرض کے لیے ہر وقت ہر جگہ ایک رسول آنا چاہیے۔ جب تک دنیا میں ایک رسول کا پیغام اپنی صحیح صورت میں موجود رہے اور لوگوں تک اس کے پہنچنے کے ذرائع موجود رہیں، کسی نئے رسول کی حاجت نہیں رہتی، اِلّا یہ کہ پچھلے پیغام میں کسی اضافے کی اور کوئی نیا پیغام دینے کی ضرورت ہو۔ البتہ جب انبیاء کی تعلیمات محو ہو جائیں، یا گمراہیوں میں خلط ملط ہو کر وسیلۂ ہدایت بننے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے "کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟"[۵۰] اور کیا یہ لوگ اُس کا انکار نہیں کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟[۵۱] انہوں نے کہا "دونوں جادو ہیں[۵۲] جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں" اور کہا "ہم کسی کو نہیں مانتے"۔ (اے نبی) ان سے کہو "اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو اگر تم سچے ہو، میں اسی کی پیروی اختیار کروں گا۔"[۵۳] اب اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں، اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی

ع ۵ خواہشات کی پیروی کرے۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔ع اور (نصیحت کی بات) پے در پے ہم انہیں پہنچا چکے ہیں تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہوں۔[۵۴]

جاہل نہ رہیں، تب لوگوں کے لیے یہ عذر پیش کرنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمیں حق و باطل کے فرق سے آگاہ کرنے اور صحیح راہ بتانے کا کوئی انتظام سرے سے موجود ہی نہیں تھا، پھر بھلا ہم کیسے ہدایت پا سکتے تھے۔ اسی عذر کو قطع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات میں نبی مبعوث فرماتا ہے تاکہ اس کے بعد جو شخص بھی غلط راہ پر چلے وہ اپنی کجروی کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔

۵۰؎ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سارے معجزے کیوں نہ دیے گئے جو حضرت موسیٰ کو دیئے گئے تھے۔ یہ بھی عصا کا اژدہا بنا کر ہمیں دکھاتے۔ ان کا ہاتھ بھی سورج کی طرح چمک اُٹھتا۔ جھٹلانے والوں پر ان کے اشارے سے بھی پے در پے طوفان اور زمین و آسمان سے بلاؤں کا نزول ہوتا اور یہ بھی پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے احکام لا کر ہمیں دیتے۔

۵۱؎ یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان معجزوں کے باوجود موسیٰ ہی پر تم کب ایمان لائے تھے جو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا مطالبہ کر رہے ہو۔ تم خود کہتے ہو کہ موسیٰ کو یہ معجزے دیئے گئے تھے مگر پھر بھی ان کو نبی مان کر ان کی پیروی تم نے کبھی قبول نہیں کی۔

۵۲؎ یعنی قرآن اور توراۃ۔

۵۳؎ یعنی مجھے تو ہدایت کی پیروی کرنی ہے، بشرطیکہ وہ کسی کی من گھڑت نہ ہو بلکہ خدا کی طرف سے حقیقی ہدایت ہو۔ اگر تمہارے پاس کوئی کتاب اللہ موجود ہے جو قرآن اور توراۃ سے بہتر رہنمائی کرتی ہو، تو اسے تم نے چھپا کیوں رکھا ہے؟ اسے سامنے لاؤ۔ میں بلا تامل اسکی پیروی قبول کر لوں گا۔

۵۴؎ یعنی جہاں تک حق نصیحت ادا کرنے کا تعلق ہے، ہم اس قرآن میں پیہم اسے ادا کر چکے ہیں۔ لیکن ہدایت تو اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑے اور تعصبات سے دل کو پاک کر کے سچائی کو سیدھی طرح قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"پردہ" پر چند اعتراضات اور اُن کا جواب

[پچھلے دنوں دمشق میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "پردہ" کا عربی ترجمہ "الحجاب" کے نام سے شائع ہُوا ہے۔ اس کا پہلا نسخہ جب ہمارے پاس پہنچا تو ہم نے دیکھا کہ ناشر نے دمشق کے ایک سلفی عالم استاذ ناصرالدین الالبانی سے اس پر تعقیب لکھوا کر اسے اصل کتاب کے ساتھ شامل کر دیا ہے اس تعقیب میں استاذ البانی نے عورتوں کے لیے حدودِ ستر کے مسئلے میں مولانا مودودی سے اختلاف کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محرم مردوں کے سامنے عورت کو نہ صرف چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی اجازت ہے بلکہ وہ ان کے سامنے سر، بازو اور پنڈلیاں بھی کھلی رکھ سکتی ہے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے سب سے پہلے ان احادیث پر کلام کیا ہے اور انہیں ضعیف قرار دیا ہے جن سے "پردہ" میں عنوان "عورتوں کے لیے ستر کے حدود" کے تحت استدلال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ احادیث قرآن اور سنتِ ثابتہ کے خلاف ہیں اور آخر میں انہوں نے چند ایسی احادیث نقل کی ہیں جن سے ان کے نزدیک ان کے اپنے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

اس تعقیب سے چونکہ مولانا مودودی کو اتفاق نہ تھا اور ہمیں عرب ممالک سے بعض ایسے خطوط بھی موصول ہوئے کہ اس تعقیب سے اصل کتاب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، اس لیے مولانا نے ضروری سمجھا کہ اس تعقیب پر تعقیب لکھی جائے اور ناشر سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ کتاب کی مزید اشاعت اس وقت تک روک دیں جب تک مولانا کی یہ تعقیب علی التعقیب بھی اس کے ساتھ شامل نہ کر دی جائے۔ نیز اس کا اہتمام کریں کہ جن لوگوں تک کتاب پہلے پہنچ چکی ہے، انہیں بھی مولانا کی یہ تعقیب طبع کرا کے بھیج دی جائے۔

ذیل میں ہم قارئینِ ترجمان القرآن کی اطلاع اور استفادہ کے لیے مولانا کی تعقیب نقل کر رہے ہیں۔ استاذ ناصرالدین الالبانی کی پوری تعقیب درج کرنا ہم اس لیے ضروری نہیں سمجھ رہے ہے کہ مولانا کی تعقیب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے قارئین کو ان کے تمام دلائل کا خود بخود علم ہو جائے گا، کیونکہ مولانا نے ان کے ہر اعتراض کا جواب دینے سے پہلے اسے پوری طرح خود نقل کر دیا ہے ـــــ م ـ ع ـ ح]

میں استاذ ناصر الدین الالبانی کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے تکلیف فرما کر میری کتاب "الحجاب" کے بعض مقامات کی اصلاح کی کوشش فرمائی ہے لیکن مجھے ناشر کتاب پر سخت تعجب ہے کہ انہوں نے میرے علم و اجازت کے بغیر میری کتاب پر ایک تعقیب لکھوا کر بطورِ خود اسے کتاب میں شامل کر دیا اور میرے علم میں وہ صرف اس وقت آئی جب کتاب طبع ہو کر میرے پاس پہنچی۔ میرے لیے یہ بالکل ہی ایک نیا تجربہ ہے۔ اس سے پہلے مجھے بلادِ عرب، یورپ، امریکہ یا ہندوستان و پاکستان کی کوئی ایسی کتاب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے جس کے ناشر نے ایک زندہ مصنف کے علم کے بغیر اس کی کتاب پر بطورِ خود کوئی تنقید یا تعقیب لکھوا کر کتاب کے ساتھ شائع کر دی ہو اور مصنف کو یہ موقع بھی نہ دیا ہو کہ وہ اشاعت سے پہلے اسے دیکھ کر اپنی بات کہہ سکے۔ میں نہیں جانتا کہ اس طرزِ عمل کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ اگر ناشر نے دینی اخلاص کی بنا پر یہ پسند نہیں کیا تھا کہ کتاب میں کوئی چیز ایسی شائع ہو جو اس کے علم میں صحیح نہیں ہے، تو اسے مجھ کو مطلع کرنا چاہیے تھا اور اگر کسی عالم سے اس نے کوئی تعقیب لکھوائی تھی تو وہ بھی کتاب میں شامل کرنے سے پہلے میرے پاس بھیجنی چاہیے تھی، تاکہ یا تو میں اس تنقید کی روشنی میں کتاب کی اصلاح کرتا یا اپنے نقطۂ نظر کی صحت کے دلائل بیان کر دیتا۔

اب چونکہ کتاب اس تعقیب کے ساتھ طبع ہو چکی ہے، اس لیے میں نے ناشر سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ کتاب کی مزید اشاعت اس وقت تک روک دیں جب تک میری یہ تعقیب علی التعقیب بھی اس کے ساتھ شامل نہ کر دی جائے نیز اس کا اہتمام کریں کہ جن لوگوں تک کتاب پہلے پہنچ چکی ہے انہیں بھی یہ اوراق طبع کرا کے پہنچا دیے جائیں۔

استاذ الالبانی کی فاضلانہ تعقیب کے متعلق سب سے پہلے تو میں چند اصولی باتیں عرض کروں گا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوّلاً، یہ بات اصحابِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور فاضل استاذ سے بھی پوشیدہ نہ ہوگی کہ ایک ضعیف حدیث اگر کسی مضمون کے بیان کرنے میں منفرد ہو تو اس کے ضعفِ سند کی وجہ سے اس کا حکم بھی ضعیف ہو جاتا ہے، لیکن اگر متعدد ضعیف احادیث ایک مضمون کے بیان کرنے میں متفق ہوں تو چاہے ان میں سے ہر ایک فرداً فرداً بلحاظ اسناد کتنی ہی ضعیف ہو، اُن کا مشترک مضمون قوی ہو جاتا ہے۔ استاذِ محترم نے میری نقل کردہ ایک ایک حدیث کے ضعف پر کلام کیا ہے، مگر اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ ان ضعیف احادیث کی مجموعی شہادت سے ان کے مشترک مضمون کو بھی کوئی قوت حاصل ہوتی ہے یا نہیں۔

ثانیاً، حدیثِ ضعیف کے معنی لازماً یہی نہیں ہیں کہ وہ جھوٹی اور موضوع ہے۔ اس میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ کذب کا احتمال یہ تقاضا ضرور کرتا ہے کہ اُس حکم کے معاملہ میں احتیاط برتی جائے جو اس میں بیان کیا گیا ہو۔ پھر جب کہ اُسی حکم کا ذکر متعدد دوسری ضعیف احادیث میں بھی آیا ہو تو اس کے احتمالِ صدق کا پہلو زیادہ راجح ہو جاتا ہے۔ ہم چاہے یہ نہ کہہ سکیں کہ ان احادیث سے فلاں فعل کا واجب یا حرام ہونا ثابت ہے، لیکن یہ تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ فلاں فعل شرع میں پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ اور فلاں فعل کرنا چاہیے یا نہ کرنا چاہیے۔ کم از کم اس سے شریعت کے رجحان کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

ثالثاً، یہ بات بھی فاضل استاذ سے پوشیدہ نہ ہوگی کہ فقہاء کی تلقّی بالقبول احادیث کے ضعف میں نہیں بلکہ ان کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ میں نے جو احادیث نقل کی ہیں اُن کو امام مالک، ابوداؤد، بیہقی، ابن جریر طبری، شمس الائمہ سرخسی، ابن ہمام اور دوسرے بڑے بڑے فقہاء نے لیا ہے۔ کیا یہ چیز کوئی وزن نہیں رکھتی؟

رابعاً، بلاشبہ کتاب اللہ یا سنتِ ثابتہ سے معارض ہو جانے کی صورت میں کوئی خبر بھی قابلِ قبول نہیں رہتی۔ لیکن فاضل استاذ کو میرے متعلق یہ گمان کیسے ہو گیا کہ میں کتاب اللہ یا سنتِ ثابتہ کے مقابلہ میں دنیا کی کسی چیز کو بھی قبول کر سکتا ہوں۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جسے استاذ موصوف کتاب اللہ یا سنتِ ثابتہ سے معارض سمجھ رہے ہوں اسے میں بھی معارض مان لوں۔ آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ میرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نزدیک وہ معارض نہیں ہے۔

ان ابتدائی گزارشات کے بعد اب میں الگ الگ ان احادیث کے متعلق کچھ عرض کروں گا، جو میں نے اپنی کتاب میں نقل کی ہیں اور جن پر استاذِ محترم نے نقد فرمایا ہے۔

۱۔ پہلی حدیث ابن جریر طبری نے حدثنا الحسن، قال اخبرنا عبد الرزاق قال اخبرنا معمر عن قتادۃ کی سند سے روایت کی ہے، جس میں قتادہ کہتے ہیں کہ بلغنی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یحل لامرأۃ تومن باللہ والیوم الآخر ان تخرج یدھا الا الی ھٰھنا وقبض نصف الذراع۔ "مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورت اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ اس سے زیادہ اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکالے، یہ فرما کر آپ نے نصف ذراع[1] پر اپنا ہاتھ رکھا۔"

فاضل استاذ درست بات کہتے ہیں کہ یہ حدیث مُرسَل ہے اس لیے ضعیف ہے[2]، لیکن صرف مرسل اور ضعیف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خبر بالکل جھوٹی اور ساقط الاعتبار ہی ہو۔ ہمیں یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ یہ ارسال قتادہ بن دعامہ نے کیا ہے جن کے متعلق سعید بن المسیّب کہتے ہیں "میرے پاس ان سے اچھا کوئی عراقی نہیں آیا"۔ بکیر بن عبداللہ المزنی کہتے ہیں "میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو ان سے زیادہ حافظ اور اس قابل ہو کہ جیسی حدیث سنے ویسی ہی پہنچا دے"۔ ابن سیرین کہتے ہیں "وہ لوگوں میں سب سے زیادہ حافظ ہیں"۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں "تم مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی پاؤ گے جو قتادہ سے بڑھ کر ہو۔ البتہ ان کا ہمسر شاید تمہیں کوئی مل جائے"۔ ابو زرعہ کہتے ہیں "قتادہ حسن بصری کے اصحاب میں سب سے زیادہ عالم ہیں"۔ ابو حاتم کہتے ہیں "حضرت انس کے اصحاب میں سب سے

---

[1] ذراع کے معنی ہیں بانہہ، یعنی کہنی سے کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کا حصہ۔

[2] مُرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جسے ایک تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے بیان کرے اور یہ نہ بتائے کہ اس نے کس صحابی سے وہ حدیث سنی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ ثبت زہری ہیں اور پھر قتادہ"۔ ابن سعد کہتے ہیں "قتادہ حدیث کے بیان کرنے میں ثقہ، مامون اور حجت ہیں"۔ ابن حبان کہتے ہیں "قتادہ کا شمار قرآن وفقہ کے علماء اور اپنے زمانے کے حفاظ میں ہوتا ہے"[1]۔ امام زہری نے مکحول پر ان کو ترجیح دی ہے[2]۔ امام نووی تہذیب الاسماء میں لکھتے ہیں "اجمعوا علی جلالتہ وتوثیقہ وحفظہ واتقانہ وفضلہ" ان کی جلالت، ثقاہت، حفظ، اتقان اور فضیلت پر سب کا اجماع ہے"۔ ان کو تمام ہی محدثین اور ائمۂ جرح وتعدیل نے ثقہ اور ثبت قرار دیا ہے۔ ایسے شخص کا ارسال ہر عمرو وزید کا سا ارسال تو نہیں ہے اور نہ اس کے ارسال پر ہم یہ شبہ کر سکتے ہیں کہ اس نے ضرور ناقابلِ اعتماد واسطوں سے یہ روایت لی ہوگی۔ اسی لیے اس نے بیچ کے راوی یا راویوں کے نام پر پردہ ڈال دیا خصوصاً جبکہ یہ معلوم ہے کہ ارسال کے متعدد دوسرے صحیح وجوہ بھی موجود تھے جن کی بنا پر اکابر اہل الحدیث نے بکثرت ارسال کیا ہے[3]۔ اور تمام مرسل روایات کو اٹھا کر پھینک دینے کا مسلک تو اہلِ علم میں سے شاید کسی نے بھی اختیار نہیں کیا ہے۔

اس کے بعد فاضل استاذ فرماتے ہیں "مرسل حدیث پر کسی شرعی حکم کی بنا نہیں رکھی جا سکتی، خصوصاً جبکہ وہ قرآن اور سنتِ صحیحہ کے خلاف ہو، جیسا کہ اس حدیث کا معاملہ ہے"۔

جہاں تک قرآن اور سنتِ صحیحہ کے خلاف ہونے کا دعویٰ ہے، اس کے متعلق تو میں بعد میں کچھ عرض کروں گا، لیکن یہاں اتنی بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ابن جریر اور قتادہ نہ تو قرآن سے اس قدر ناواقف ہیں کہ ایک چیز اس کے خلاف ہو مگر انہیں اس کا احساس نہ ہو، اور نہ وہ ایسے جری ہیں کہ جان بوجھ کر ایک مخالفِ قرآن بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیں۔ ایسا دعویٰ کرنے سے پہلے استاذ ناصر الدین کو اپنی جگہ اچھی طرح غور کر لینا چاہیے تھا کہ وہ کیا فرما رہے ہیں۔

[1] یہ تمام اقوال تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر سے منقول ہیں۔

[2] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱

[3] مثال کے طور پر اس زمانے میں ارسال کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی تھی کہ سیاسی حیثیت سے حکومتِ وقت جن بزرگوں کی دشمن ہوتی تھی ان کے نام لے کر روایت بیان کرنا بعض حالات میں مشکل ہو جاتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر استاذ محترم بلا کسی دلیل کے محض اپنے گمان کی بنا پر یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ قتادہ کی اس مُرسل روایت میں ان کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ خالد بن دُریک عن عائشہ ہی ہے۔ اس دعوے کے لیے استاذ کے پاس کوئی دلیل اس کے سوا نہیں ہے کہ قتادہ کی ایک اور مُرسل روایت میں یہ واسطہ بیان ہوا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت لم یصلح ان یُری منھا الا ھذا و ھذا۔ "اے اسماء! عورت جب بالغ ہو جائے تو جائز نہیں ہے کہ منہ اور ہاتھ کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے"۔ ان دونوں حدیثوں کے الفاظ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ کوئی شخص بھی انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی حدیث کے متن ہیں۔ اس لیے یہ قیاس زیادہ قرینِ عقل ہے کہ قتادہ کو یہ حدیث کسی اور واسطے سے پہنچی ہوگی بہ نسبت اس کے کہ محض مضمون کی مناسبت دیکھ کر اسے بھی خواہ مخواہ عن خالد بن دُریک عن عائشہ کی سند سے لے جا کر جوڑ دیا جائے۔

آخر میں استاذ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس حدیث کے متن کو ضبط کرنے میں رواۃ نے اختلاف کیا ہے اور یہ اضطراب ضعف کا اہم سبب ہے۔ استاذ کا مطلب یہ ہے کہ دو روایتوں میں تو نصف ذراع کو عورت کے ستر سے مستثنیٰ کیا گیا ہے مگر دو میں کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کو داخلِ ستر قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اضطراب کا دعویٰ اسی صورت میں صحیح ہو سکتا تھا جبکہ یہ سب ایک ہی حدیث کے متن ہوتے۔ اور اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہ چار الگ الگ حدیثیں ہیں جن میں اختلاف ہے، مگر وہ اختلاف ایسا نہیں ہے جو رفع نہ ہو سکتا ہو۔ ہم بڑی آسانی کے ساتھ ان کو اس طرح تطبیق دے سکتے ہیں کہ عام حالات میں عورت کو کلائی تک ہی اپنی آستین دراز رکھنی چاہیے، البتہ کوئی ضرورت پیش آئے یا مجبوری لاحق ہو تو نصف ذراع تک آستین چڑھا لینے کی اجازت ہے۔ گویا یہ عورتِ مغلظہ اور عورتِ مخففہ[1] کا فرق ہے۔ نصف ذراع اور کلائی کے درمیان کا حصہ عورتِ مغلظہ نہیں ہے، مگر معمولاً ہر وقت کھلا رکھنے

---

[1] عورتِ مغلظہ کے معنی ہیں ستر کی وہ حد جس کے بارے میں سختی کی گئی ہے اور عورتِ مخففہ کا مطلب یہ ہے کہ جس کے معاملہ میں نرمی کی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے بھی نہیں ہے۔[1] کیا ایسا معمولی اختلاف جو ذرا سے تأمل کے ساتھ رفع کیا جا سکتا ہو، احادیث کو اٹھا کر پھینک دینے کے لیے کافی وجہ ہے؟ کیا محدثین مختلف احادیث میں تطبیق یا ترجیح کی کوشش نہیں کرتے اور اختلاف دیکھتے ہی سب کو بس اٹھا کر پھینک دیا کرتے ہیں؟

۲- دوسری حدیث ابوداؤد نے مراسیل میں قتادہ سے روایت کی ہے کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الجاریۃ اذا حاضت لم یصلح ان یریٰ منھا الا وجھھا ویداھا الی المفصل "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عورت بالغ ہو جائے تو صحیح نہیں ہے کہ اس کے چہرے اور کلائی تک ہاتھوں کے سوا کوئی اور چیز نظر آئے۔"

اس پر استاذ الالبانی نے پہلی گرفت یہ کی ہے کہ میں نے حوالہ میں صرف ابوداؤد لکھ دیا جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ حدیث اُن کی سُنن میں ہے، حالانکہ یہ ان کی مراسیل میں ہے۔ یہ اعتراض ان کا بجا ہے۔ بے شک یہ چوک مجھ سے ہوئی ہے جس کے لیے میں قارئین سے معذرت چاہتا ہوں۔

دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ یہ قتادہ کی مرسل روایت ہے اور اس میں وہی ضعف موجود ہے جو حدیث اوّل میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ضعف کے ساتھ قوت کا بھی وہی سبب موجود ہے جو اوپر میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ اکابر تابعین میں سے ایک امام کی مرسل ہے جس کے ثقہ اور ثبت اور حافظ متقن ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور یہ کوئی منفرد حدیث بھی نہیں ہے بلکہ دوسرے طریقوں سے بھی اس کے شواہد وارد ہوئے ہیں۔

[1] عورتِ مغلظہ اور عورتِ مخففہ کے اس فرق پر خود ان احادیث کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ قتادہ کی پہلی روایت میں اور ابن جریج کی اس روایت میں جو آگے آرہی ہے، نصف الذراع کے لیے "لا یحل" (جائز نہیں ہے) کے الفاظ آئے ہیں، لیکن قتادہ کی دوسری روایت اور خالد بن دریک کی روایت میں، جنہیں ابھی ابھی ہم نقل کرنے والے ہیں، کلائی کے جوڑ اور نصف ذراع کے درمیان والے حصے کے لیے "لم یصلح" (درست نہیں ہے) کے الفاظ ہیں۔ ان دونوں قسم کی احادیث میں وجہ تطبیق یہ ہے کہ نصف الذراع کے لیے "لا یحل" کے الفاظ عورتِ مغلظہ پر دلالت کرتے ہیں اور الی المفصل اور الی الکفین کے لیے "لم یصلح" کے الفاظ عورتِ مخففہ پر دلالت کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

تیسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ یہ اور حدیثِ اوّل دراصل ایک ہی حدیث ہیں، کیونکہ ان کا مدار قتادہ کے ارسال پر ہے۔ لیکن دو حدیثوں کو ایک قرار دینے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے کہ صرف راوی کے واحد ہونے کی وجہ سے انہیں ایک قرار دے دیا جائے۔ دونوں حدیثوں کے الفاظ اور مضمون کا صریح اختلاف دیکھنے کے باوجود آخر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ہی حدیث کا متن ہے جو قتادہ نے دو روایتوں میں مختلف طریقوں سے بیان کر دیا ہے، خصوصاً جبکہ قتادہ کے متعلق مُزنی کی شہادت موجود ہے کہ "میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو قتادہ سے بڑھ کر حافظ اور اس قابل ہو کہ جیسی حدیث سنے، ویسی ہی بیان کر دے"۔ اس لیے صحیح قیاس یہی ہے کہ یہ دو الگ حدیثیں ہیں جو قتادہ کو مختلف طریقوں سے پہنچی ہیں۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ ان کے متن میں اضطراب ہے، حالانکہ یہ اضطراب کا دعویٰ اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جبکہ دونوں کو ایک ہی حدیث کا متن قرار دیا جائے، جو ثابت نہیں ہے۔ اور دو الگ حدیثوں کے متن ہونے کی صورت میں، جیسا کہ بظاہر محسوس ہوتا ہے، اسے اضطراب نہیں بلکہ اختلاف کہنا چاہیے جس کے جمع و تطبیق کی صورت اوپر میں نے عرض کر دی ہے۔ استاذ الالبانی اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ احادیث میں اگر اختلاف ہو اور کوئی صورت ان کی تطبیق یا کسی ایک کی ترجیح کی ہو سکتی ہو تو محض اختلاف کو تمام احادیث کے مجموعاً رد کر دینے کے لیے حجت نہیں بنایا جا سکتا۔

۳- تیسری حدیث ابن جریر طبری نے حدثنا القاسم قال حدثنا الحسین قال حدثنا حجاج عن ابن جریج کی سند سے نقل کی ہے جس میں ابن جریج حضرت عائشہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھتیجی بنت عبداللہ بن الطفیل کو دیکھ کر منہ پھیر لیا اور فرمایا: اذا عرکت المرأۃ لم یحل لھا ان تظھر الا وجھھا والا ما دون ھذا وقبض علی ذراع نفسہ وترک بین قبضتہ وبین الکف مثل قبضۃ اخری۔ "جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے منہ کے سوا اور اپنے ہاتھ کے سوا اپنے جسم کا کوئی حصہ کھولے اور ہاتھ کی حد آپ نے خود اپنی کلائی پر ہاتھ رکھ کر اس طرح بتائی کہ آپ کی مٹھی اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی کی جگہ اور باقی تھی"۔

© rasailojaraid.com

اس کے متعلق استاذ فاضل فرماتے ہیں کہ "یہ روایت منقطع بلکہ معضل ہے، اس لیے کہ ابن جریج اور حضرت عائشہ کے درمیان کئی واسطے چھوٹے ہوئے ہیں" درست ہے۔ یہ بات کس سے چھپی ہوئی ہے کہ ابن جریج اور حضرت عائشہ کے درمیان زمانے کا بڑا فاصلہ ہے، اور ظاہر ہے کہ بیچ میں ایک سے زیادہ راوی غیر مذکور ہیں۔ لیکن اس میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس حدیث کا مضمون قتادہ کی مرسل حدیث نمبر (۱) کے بالکل مطابق ہے، اس لیے دونوں ایک دوسرے کی تائید کر کے نفسِ مضمون کو قوی کر دیتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ابن جریج کوئی غیر معتبر شخص بھی نہیں ہیں۔ میزان الاعتدال میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ احد الاعلام الثقات. یدلس وھو فی نفسہ ثقۃ فاضل وکان یدلس ویرسل" بڑے نامور ثقہ لوگوں میں سے ہیں۔ تدلیس ضرور کرتے ہیں مگر بجائے خود فقیہ فاضل آدمی ہیں۔ یہ تدلیس بھی کرتے تھے اور ارسال بھی" تقریب التہذیب میں ان کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "کان من اوعیۃ العلم، اثبت الناس فی عطاء" علم کے بڑے مخزنوں میں سے ایک تھے، عطاء بن ابی رباح کی روایات بیان کرنے میں سب سے زیادہ معتبر ہیں" نیز یہ کہ ابن جریج ثبت صحیح الحدیث لم یحدث بشیء الا اتقنہ" ابن جریج ثبت ہیں، صحیح الحدیث ہیں، کوئی چیز روایت نہیں کرتے جب تک کہ پختہ نہ کر لیں" علی بن المدینی کا قول ان کے حق میں یہ ہے "پوری زمین پر عطاء کو جاننے والا ابن جریج سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ میں نے اپنے والد سے ان کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ صالح الحدیث (یعنی حدیث کو درست طریقہ سے بیان کرنے والے) ہیں" خود عطاء بن ابی رباح کی رائے ان کے بارے میں یہ تھی کہ وہی اس کے اہل ہیں کہ ان کے بعد ان کی مجلس کے جانشین ہوں۔ ابن حبان نے بھی ان کو ثقات میں شمار کیا ہے اور ان کا قول ان کے بارے میں یہ ہے کہ وہ اہلِ حجاز کے فقہاء، قراء اور متقن لوگوں میں سے تھے اور تدلیس کرتے تھے" اس میں شک نہیں کہ اس توثیق کے ساتھ ان پر جرح بھی کی گئی ہے۔ مثلاً ان پر تدلیس کا الزام ہے یحییٰ بن سعید کہتے ہیں" ابن جریج نہایت سچے آدمی تھے، چنانچہ جب وہ حدثنی کہیں تو وہ ان کا سماع (سننا) ہوتا ہے اور جب اخبرنی کہیں تو وہ ان کی قراءت (پڑھنا) ہوتی ہے اور جب قال کہیں تو ان کی بات ہوا کے مانند ہوتی ہے" لیکن اس طرح کی عام جرحوں کی بنا پر کیا یہ درست ہوگا کہ ابن جریج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسے شخص کی ہر ایسی روایت کو دیوار سے دے مارا جائے جس میں انہوں نے قال فلان کہا ہو، خصوصاً جبکہ دوسرے طریقوں سے بھی اس کے شواہد اور متابعات موجود ہوں جو اس کے مضمون کو قوی کر رہے ہوں؟

استاذ فاضل نے اس روایت کے متعلق بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ قرآن کے معارض ہے۔ اس معارضہ کے متعلق تو میں بعد میں کچھ عرض کروں گا، لیکن آخر ابن جریر اور ابن جریج جیسے دو فقیہوں اور مفسروں کے بارے میں استاذ محترم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ فہم قرآن سے اس درجہ عاری تھے کہ ایک روایت نقل کر گئے اور ذرا نہ سمجھے کہ یہ قرآن کے معارض ہے؟

۴ - ابوداؤد نے اپنی سنن میں حدثنا یعقوب بن کعب الانطاکی و مؤمل بن الفضل الحرانی قالا حدثنا الولید عن سعید بن بشیر عن قتادۃ عن خالد بن دریک عن عائشۃ کی سند سے روایت بیان کی ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے باریک کپڑے پہنے ہوئے آئیں، تو حضورؐ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا "اے اسماء ---- اور بیہقی کی ایک روایت میں ہے "اے اسماء! یہ کیا؟ ---- جب عورت بالغ ہو جائے تو درست نہیں ہے کہ منہ اور ہاتھ کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ نظر آئے۔"

فاضل استاذ اس حدیث پر دو اعتراض کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ منقطع ہے کیونکہ خالد بن دریک حضرت عائشہؓ سے نہیں ملے تھے۔ دوسرے یہ کہ یہ ضعیف ہے کیونکہ سعید بن بشیر کو حافظ ابن حجر نے تقریب میں ضعیف لکھا ہے۔

پہلے اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے کہ خالد بن دریک کو قریب قریب سب ہی ائمہ جرح و تعدیل نے ثقہ قرار دیا ہے[1] اور ثقات کی مراسیل کا مرتبہ ضعفاء کی مراسیل سے بداہتہً مختلف ہے۔ دوسرا جواب میں اپنی طرف سے دینے کے بجائے امام بیہقی کی طرف سے نقل کیے دیتا ہوں۔ وہ کتاب الصلوٰۃ، باب عورۃ المرأۃ الحرۃ میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اور یہ بتانے کے بعد کہ ابوداؤد اسے مرسل کہتے ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر۔ تقریب التہذیب حافظ ابن حجر۔ میزان الاعتدال ذہبی اور الجرح والتعدیل: ابن ابی حاتم رازی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیونکہ خالد بن دریک نے حضرت عائشہ کو نہیں پایا، لکھتے ہیں" اس مرسل حدیث کے ساتھ بہت سے صحابہ کے اقوال بھی ہیں جن میں اس زینتِ ظاہرہ کا بیان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا جو مضمون اس حدیث میں بیان ہوا ہے، وہ ان کے ساتھ مل کر قوی ہو گیا" یہ وہی بات ہے جو میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ایک حدیث اگر بجائے خود ضعیف بھی ہو تو دوسرے شواہد کی تائید اس کے مضمون کو قوی کر دیتی ہے۔ اور یہ طرزِ عمل صحیح نہیں ہے کہ ایک ایک حدیث کے ضعف پر کلام کر کے سرے سے اُس مضمون ہی کو رد کر دیا جائے، جو مجموعی طور پر ان سب احادیث سے ثابت ہو رہا ہے۔

رہا سعید بن بشیر کا ضعف، تو پہلی بات یہ ہے کہ کسی نے بھی اس کو کذّاب اور وضّاع یا فاسق یا مبتدع نہیں کہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو جرح اس پر کی گئی ہے، وہ بس "ضعف" کی ہے۔ پھر اس ضعف پر بھی سب کا اتفاق نہیں ہے۔ تہذیب التہذیب میں اس کے متعلق جو اقوال ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

شُعبہ: "وہ زبان کا سچا ہے" دوسری روایت میں "حدیث بیان کرنے میں سچا" کے الفاظ ہیں۔

ابن عُیَیْنَہ: وہ حافظ تھا۔

ابو مُسہر: "ہمارے لشکر — یعنی شہر — میں اس سے زیادہ حافظ کوئی شخص نہ تھا۔ اور وہ ضعیف منکر الحدیث ہے"۔

ابو زُرعہ: میں نے عبد الرحمٰن بن ابراہیم سے دریافت کیا کہ جن لوگوں نے اسے پایا ہے، ان کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب دیا "وہ لوگ اسے ثقہ قرار دیتے ہیں"۔

عثمان دارمی: "میں نے دُحیم کو اسے ثقہ قرار دیتے ہوئے سُنا ہے"۔

المیمونی: "میں نے ابو عبد اللہ — یعنی امام احمد — کو اسے ضعیف قرار دیتے ہوئے سُنا ہے"۔

ابن معین: "وہ کچھ نہیں۔ قوی الحدیث نہیں ہے۔ قتادہ سے منکر روایات نقل کرتا ہے"۔

بخاری: اس کے حفظ میں لوگوں نے کلام کیا ہے اور اس کا احتمال ہے"۔

ابن ابی حاتم: "میں نے اپنے والد اور ابو زرعہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اس کا مقام ہمارے نزدیک صدق کا ہے"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نسائی: "وہ ضعیف ہے"

حاکم ابو احمد: "محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے"

الساجی: "اس نے قتادہ سے منکر روایات نقل کی ہیں"

الآجری عن ابی داود: "ضعیف ہے"

ابن حبان: وہ خراب حافظے کا اور سخت قسم کی غلطیاں کرنے والا آدمی ہے۔ قتادہ سے ایسی روایتیں نقل کرتا ہے جن کی دوسری احادیث سے تائید نہیں ہوتی"

ابوبکر بزار: "ہمارے نزدیک وہ بالکل ٹھیک ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں"

الجرح والتعدیل میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ حیات بن شریح بیان کرتے ہیں کہ میں نے بقیہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے شعبہؒ سے سعید بن بشیر کے متعلق ان کی رائے دریافت کی تو انہوں نے جواب دیا، "وہ صدوق اللسان (یعنی زبان کا سچا آدمی) ہے" میں نے یہی بات سعید بن عبدالعزیز سے بیان کی تو انہوں نے فرمایا۔ اس کلام کو ہمارے لشکر (یعنی ہمارے شہر) میں پھیلا دو۔ اس لیے کہ لوگوں نے سعید بن بشیر کے بارے میں کلام کیا ہے"

اب استاذ الالبانی خود غور فرمائیں کہ جہاں جرح اور تعدیل دونوں متضارب ہوں اور تعدیل کا پلڑا کسی طرح بھی جرح کے پلڑے سے ہلکا نہ ہو، وہاں محض جرح کا سہارا لے کر احادیث کو اسی طرح اٹھا پھینکنا چاہیے؟

۵۔ موطا میں امام مالک عن علقمہ بن ابی علقمہ عن اُمّہ کی سند سے روایت کرتے ہیں ودخلت حفصة بنت عبدالرحمن علی عائشة زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی حفصة خمار رقیق فشقته عائشة وکستها خمارا کثیفاً "حفصہ بنت عبدالرحمٰن حضرت عائشہ ام المومنین کے ہاں اس حال میں آئیں کہ ان کے سر پہ باریک دوپٹہ تھا حضرت عائشہ نے اسے پھاڑ دیا اور انہیں موٹا دوپٹہ اڑھایا" (اس حدیث کو بیہقی نے بھی اپنی سنن کے الباب لبس المصلی میں روایت کیا ہے)۔

اس کے متعلق استاذ موصوف کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل نہیں بلکہ ایک صحابیہ کا فعل ہے۔ مگر کیا استاذ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آثارِ صحابہ ناقابل احتجاج ہیں اور ان سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی؟ یا ان کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں شریعت کا منشا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معلوم کرنے کے لیے امہات المومنین کا عمل کوئی معتبر ذریعہ نہیں ہے ؟

دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ حضرت عائشہ کے اس واقعہ کی راوی ام علقمہ ہیں جن کے متعلق ذہبی نے کہا ہے " لا تعرف " (وہ معروف نہیں ہیں) ۔ رہی یہ بات کہ ابن حبان نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے ، تو استاذ موصوف کے نزدیک وہ قابلِ اعتبار نہیں کیونکہ " ان کا توثیق میں متساہل ہونا معلوم ہو چکا ہے " لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں استاذ نے ذہبی اور ابن حبان سے آگے بڑھ کر کچھ زیادہ جستجو کی کوشش نہیں فرمائی ۔

امام بخاری نے کتاب الصیام ، کتاب الادب اور کتاب الحیض میں ان کی روایات لی ہیں ۔ ابن حجر تقریب التہذیب میں فرماتے ہیں " امام بخاری نے کتاب الحیض میں ان کی روایات لی ہیں اور وہ قابلِ قبول ہیں " نیز تہذیب التہذیب میں وہ العجلی کا قول نقل کرتے ہیں " مدنیة تابعیة ثقة " تاہم اگر کوئی بھی انہیں نہ جانتا ہو تو کیا امام مالک کا جن کے شہر کی وہ رہنے والی تھیں ، ان کو جاننا کافی نہ تھا ؟

اس ذرا سے سہارے پر موطا کی اس روایت کی تضعیف کرتے ہوئے استاذ محترم نے یہ بھی لحاظ نہ فرمایا کہ اس روایت کے متعدد متابعات موجود ہیں ۔ اسی درِ منثور میں اسی صفحہ پر جس کا حوالہ استاذ نے اپنی تعقیب میں دیا ہے یہ روایت موجود ہے " سعید بن منصور اور ابن مردویہ حضرت عائشہ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت ان کے ہاں آئی اور اس کے سر پہ باریک اوڑھنی تھی جس میں اس کی پیشانی صاف جھلکتی تھی ۔ حضرت عائشہ نے اسے لیکر پھاڑ دیا اور فرمایا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں کیا ارشاد فرمایا ہے ؟ پھر ایک دوسری اوڑھنی منگا کر اسے اڑھائی " ۔ اسی طرح بخاری ، ابوداؤد ، نسائی اور بیہقی عن عروۃ بن الزبیر عن عائشہ کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ شروع زمانے کی مہاجر خواتین پر رحمت فرمائے ۔ جونہی کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آیا ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن تو فوراً ہی انہوں نے اپنی موٹی سے موٹی چادریں لیکر ان کی اوڑھنیاں بنالیں " (بیہقی کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ سے خمار (اوڑھنی) کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا انما الخمار ما واری البشرۃ والشعر ۔ اوڑھنی وہ ہے جو جلد اور بالوں کو چھپا دے) ۔ یہ تو تنہا حضرت عائشہ ہی کے فعل کی حکایت نہیں ہے بلکہ عہد نبوی کی مہاجر خواتین کے عام عمل کی حکایت ہے ۔ پھر بیہقی عبداللہ بن ابی سلمہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں میں مصر کی بنی ہوئی ایک باریک ململ (قباطی) تقسیم کی اور فرمایا " دیکھو تمہاری عورتیں اس کی قمیصیں نہ بنائیں " ایک آدمی نے عرض کیا امیرالمومنین میں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی بیوی کو یہ کپڑا اُڑھا کر آگے پیچھے ہر طرف سے دیکھا، مجھے تو بدن جھلکتا نظر نہیں آیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "صاف نہ جھلکے مگر جسم کی کیفیت تو ظاہر کر دیگا۔"

ان سب آثارِ صحابہ سے بڑھ کر یہ مرفوع روایات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تو احادیث میں مروی ہیں:

اُسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موٹی قباطی عطا کی جو آپ کو دِحیہ کلبی نے بطورِ ہدیہ پیش کی تھی۔ میں نے وہ اپنی بیوی کو پہنا دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا "کیا بات ہے تم وہ قباطی نہیں پہنتے؟" میں نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول میں نے وہ اپنی بیوی کو پہنا دی" فرمایا "اپنی بیوی سے کہہ دو کہ اس کے نیچے استر لگا لے، اس لیے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے جسم کی ساخت نمایاں ہو گی۔" (احمد و بیہقی)۔

دِحیہ کلبی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصر کی بنی ہوئی باریک ململ (قباطی) آئی۔ آپ نے اس میں سے ایک ٹکڑا مجھے دیا اور فرمایا "ایک حصہ پھاڑ کر کرتا بنا لو اور ایک حصہ اپنی بیوی کو دوپٹہ بنانے کے لیے دے دو۔ مگر ان سے کہہ دو کہ تجعل تحتہ ثوبا لا یصفہا " اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لیں تاکہ جسم اندر سے نہ جھلکے۔" (ابو داؤد باب فی لبس القباطی للنساء، البیہقی فی ابواب لبس المصلی)۔

اتنے قوی شواہد اور مؤیدات کی موجودگی میں مؤطا کی اس روایت کو محض اس کے موقوف اور اس کی راویہ کے غیر معروف ہونے کی دلیل پر رد کر دینا سخت قابلِ تعجب ہے۔

۶- المبسوط کی روایت "لعن اللہ الکاسیات العاریات" اللہ نے لعنت کی اُن عورتوں پر جو کپڑے پہن کر بھی ننگی رہیں" کے متعلق استاذ الالبانی نے ٹھیک لکھا ہے کہ یہ الفاظ کتب حدیث میں نہیں ملتے۔ میں نے بھی یہ الفاظ صرف امام سرخسی کی المبسوط ہی میں پائے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ امام موصوف کو یہی الفاظ کسی حدیث میں ملے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ کی اُس روایت کو معناً بیان کیا ہو جسے امام احمد، مسلم اور بیہقی نے نقل کیا ہے کہ صنفان من اھل النار لم ارھما بعدُ نساء کاسیات عاریات مائلات ممیلات علی رؤسھن امثال اسنمۃ البخت المائلۃ لا یرین الجنۃ ولا یجدن ریحھا "دو قسم کے لوگ اہلِ دوزخ میں سے ہیں، مگر ابھی میری نگاہوں نے انہیں دنیا میں دیکھا نہیں ہے۔ ان میں سے ایک ان عورتوں کا گروہ ہے جو کپڑے پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں لچکے کھاتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کمر دنبیں ٹیڑھی کرتی ہیں، سروں پر ان کے ایسے گندھے ہوئے بال ہیں جیسے بختی اونٹوں کے کوہان، وہ جنت کو کبھی نہ دیکھیں گی اور نہ کبھی اُس کی ہوا ان تک پہنچے گی" اگر یہ روایت نہیں تو ممکن ہے کہ ان کا ماخذ وہی روایت ہو جسے امام احمد، طبرانی اور حاکم کے حوالے سے خود استاذ نے نقل کیا ہے[1]۔

بہرحال اس حدیث کے متعلق فاضل استاذ کا خیال ہے کہ "اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو نہایت رقیق و شفاف کپڑے پہن کر بازاروں میں پھرتی ہیں"۔ اور اس بنا پر انہوں نے تعجب ظاہر کیا ہے کہ اس کا "عورت کے حدودِ ستر" سے کیا تعلق ہے، کیونکہ ستر تو وہ ہے جو محرم اور غیر محرم سب سے چھپایا جانا چاہیے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ استاذ البانی کے اس قول کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد صرف بازاروں اور راستوں میں چلنے والی عورتوں سے متعلق ہے۔ اوپر حضرت ابوہریرہ کی روایت کے الفاظ ناظرین کے سامنے موجود ہیں۔ وہ خود دیکھ لیں کہ اس میں کونسا اشارہ بازاروں میں چلنے والی عورتوں کے ساتھ اس کے مخصوص ہونے کی طرف ہے۔ نیز اس مضمون سے قریبی تعلق رکھنے والی دوسری متعدد روایات جو میں نے اوپر نمبر ۵ میں نقل کی ہیں، ان کو بھی دیکھ لیا جائے۔ وہ سب گھر کی زندگی میں عورت کے لباس سے متعلق ہیں نہ کہ بازاروں میں نکلنے کے لباس سے۔ استاذ محترم کا مطلب شاید یہ ہے کہ عورتوں کو ساتر اور پردہ پوش لباس صرف اجنبیوں کے سامنے پہننا چاہیے، باقی رہے محرم رشتہ دار، تو ان کے سامنے گھروں میں نیم برہنہ رہنے یا ایسا رقیق و شفاف لباس پہننے کی کھلی اجازت ہے جس کے اندر سے بازو، سینہ، پیٹ، کمر، پنڈلیاں اور رانیں صاف جھلک رہی ہوں۔ اسی لیے وہ فرماتے ہیں "رہی یہ بات کہ حدیث سے یہ استدلال کیا جائے کہ عورت کے حدودِ ستر محرم مردوں کے سامنے بھی وہی ہیں جو غیر محرم مردوں کے سامنے ہیں تو اس حدیث سے اس کا کسی طرح بھی پتہ نہیں چلتا"۔ مگر میں عرض کروں گا کہ اگر یہی ان کا مطلب ہے تو وہ اس پر کوئی مثبت دلیل لائیں محض یہ دعویٰ کہ یہ حدیث بازاروں میں چلنے والی عورتوں سے متعلق ہے، اتنی بڑی بات ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

---

[1] وہ روایت یہ ہے: سیکون في آخر امتی رجال یرکبون علی السروج کاشباہ الرحال، ینزلون علی ابواب المساجد، نساؤھم کاسیات عاریات علی رؤسھن کاسنمۃ البخت العجاف، العنوھن فانھن ملعونات"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے اس جرح کا حال جو استاذ فاضل نے میری مستدل بہ احادیث پر کی ہے۔ اول تو فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک کی تضعیف ہی میں کھلا مبالغہ ہے، حالانکہ فی الواقع وہ اس درجہ ضعیف نہیں ہیں جتنا استاذ نے ان کو قرار دیا ہے۔ پھر انہوں نے ایک ایک کے ضعف کی بنا پر ان کے مجموعہ کو رد کر دینے کا عجیب مسلک اختیار کیا ہے، حالانکہ وہ ایک دوسرے کی تائید کر کے اپنے مشترک مضمون کو اتنا قوی بنا رہی ہیں کہ اس پر حجت قائم ہو سکتی ہے۔ اب میں ان کے اس دعوے کو لیتا ہوں جسے انہوں نے بار بار دہرایا ہے کہ یہ احادیث قرآن کے خلاف ہیں۔ اس پورے دعوے کی دو بنیادیں استاذ نے بیان کی ہے:

اوّل یہ کہ قرآن کہتا ہے وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ "وہ اپنی زینت نہ ظاہر کریں مگر اپنے شوہروں کے لیے"۔ اس آیت سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ "یہ اس بات پر نص ہے کہ عورت کو اپنے ان محرم مردوں کے سامنے اپنی زینت کے ظاہر کرنے کی اجازت ہے جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔ اب یہ بات کیسے معقول ہو سکتی ہے کہ عورت کے لیے اُن اعضاء کا چھپانا واجب ہو جن کی زینت ظاہر کرنے کی اسے اجازت دی گئی ہے، مثلاً سر کی زینت اپنے محارم کے سامنے ظاہر کرنے کا عورت کو حق دیا گیا ہے۔ یہ زینت وہ کیسے ظاہر کر سکتی ہے جبکہ سر کا چھپانا اس کے لیے واجب ہو۔ اظہارِ زینت تو اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اس حصۂ جسم کا اظہار کیا جائے جس پر وہ زینت ہے"۔

اس کے جواب میں مَیں عرض کروں گا کہ اوّل تو ہر زینت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جسم کے اس حصہ کو برہنہ ہی کیا جائے جس پر وہ زینت ہو۔ آخر نفیس لباس بھی تو عورت کی زینت ہے۔ کیا استاذ یہ فرمائیں گے کہ اس زینت کے اظہار کی اجازت سے جسم کے اُن تمام حصّوں کا عریاں کرنا جائز ہو جاتا ہے جن پر زینت ہو؟ تاہم اگر زینت سے مراد صرف زیور اور سنگھار (میک اپ) ہی لیا جائے تو دیکھنا چاہیے کہ یہ زینت جسم کے کس حصّہ میں ہوتی ہے؟ نصوص کی رو سے عورت کا ستر چہرے، ہاتھوں (کفین) اور پاؤں (قدموں) کے سوا اس کا پورا بدن ہے۔ اس میں سے وجہ (چہرہ) کا اطلاق محض چہرے کی ٹکیہ (قرص) ہی پر نہیں ہوتا بلکہ عرفِ عام کے لحاظ سے دونوں کان بھی اس میں شامل ہیں۔ نیز ہاتھوں کے معاملہ میں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، عورتِ مخفّفہ کلائی کے جوڑ تک ہے، لیکن عورتِ مغلّظہ کی حد نصف ذراع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے شروع ہوتی ہے۔ رہے قدمین (پاؤں)، تو وہ کعبین (ٹخنوں) تک ستر سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے اوپر عورتِ مغلظہ ہے۔ سر کے متعلق، جیسا کہ میں آگے بتاؤں گا، نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت مغلظہ میں سے نہیں بلکہ مخففہ میں سے ہے، یعنی معمولاً اسے ڈھانکے رکھنا چاہیے، البتہ بضرورت اس کو محارم کے سامنے کھولا جا سکتا ہے۔ اب عورت اپنی زینت کے لیے جتنے بھی زیور پہنتی ہے، وہ زیادہ تر دونوں کانوں، سر کے اگلے حصے، ناک، پیشانی، کلائی اور ٹخنوں میں ہوتے ہیں، جنہیں کھولنے کی محرم مردوں کے سامنے اجازت ہے۔ ان کے سوا جو زیور جسم کے دوسرے حصوں میں پہنے جاتے ہیں، انہیں برہنہ جسم پر پہننے کے بجائے کپڑوں پر پہننا چاہیے۔ یہی بات حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی نصوص سے سمجھی ہے۔ چنانچہ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ کے متعلق وہ فرماتے ہیں "وہ زینت جسے عورت اپنے محرم مردوں کے سامنے ظاہر کرے گی، اس سے مراد اس کی بالیاں، ہار اور کنگن ہیں۔ رہی اس کی پازیب اور بازو بند اور اس کا گلا اور اس کے بال، تو وہ انہیں اپنے شوہر کے سوا کسی اور کے سامنے نہ کھولے گی (ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، سنن بیہقی، بحوالہ الدر المنثور ج ۵ ص ۴۲)

دوسری دلیل جو فاضل استاذ نے قرآن سے پیش فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ آیت وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (جب تم ان سے کوئی چیز طلب کرو تو پردہ کے پیچھے سے طلب کرو) کے عموم سے اللہ تعالیٰ نے لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ ... (کوئی مضائقہ نہیں ہے ان کے لیے ان کے باپوں ...) فرما کر محارم کو مستثنیٰ کر دیا ہے"۔ لیکن مجھے استاذ الالبانی جیسے فاضل شخص پر تعجب ہے کہ وہ اس معاملہ کو اس بحث میں کہاں سے لے آئے؟ آخر کس نے یہ کہا تھا کہ عورت کو محارم سے حجاب کرنا چاہیے؟ یہاں تو بحث پردے کی نہیں بلکہ عورت کے حدودِ ستر کی ہے، جنہیں شوہر کے سوا باقی سب کے سامنے اسے چھپانا چاہیے۔ کیا استاذ کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ محارم حجاب کے حکم سے مستثنیٰ ہیں، اس لیے عورت کو ان کے سامنے اپنا ستر بھی کھول دینا چاہیے، اور اپنے گھر میں اسے نیم برہنہ ہی رہنا چاہیے؟

اس کے بعد استاذ نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ عورت کے حدودِ ستر کے بارے میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، وہ سنتِ صحیحہ کے خلاف ہے، چند احادیث پیش فرمائی ہیں۔ میں مختصراً ان پر بھی کچھ عرض کروں گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلی حدیث یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک غلام کے ساتھ حضرت فاطمہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھیں جس سے سر ڈھانکتی تھیں تو پاؤں (رجلین) کھل جاتے تھے اور پاؤں ڈھانکتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر فرمایا "لیس علیک بأس انما ھو ابوک وغلامک" (کوئی مضائقہ نہیں۔ یہاں صرف تمہارے والد اور غلام ہی تو ہیں)۔ استاذ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "بیٹی کا سر اور پاؤں اس کے باپ کے لیے ستر نہیں ہیں اور یہ اس مسلک کے خلاف ہے جسے مؤلف نے ـــ یعنی میں نے ـــ اختیار کیا ہے یعنی یہ کہ چہرے اور ہاتھوں کے سوا عورت کی ہر چیز داخل ستر ہے۔"

مگر اس حدیث سے استدلال کرنے میں فاضل استاذ نے دو باتوں پر غور نہیں فرمایا۔ ایک یہ کہ یہ مجبوری کی حالت تھی جس میں حضرت فاطمہ کے پاس کوئی ایسا کپڑا نہ تھا جس سے وہ سر اور پاؤں ایک ساتھ ڈھانک سکتیں۔ دوسرے یہ کہ اپنے والد ماجد اور غلام کو دیکھ کر آخر حضرت فاطمہ کو یہ اضطراب کیوں لاحق ہوا کہ وہ سر اور پاؤں ڈھانکیں؟ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں صحابیات محارم کے سامنے ان چیزوں کو ڈھانکے رکھنے کا اہتمام کیا کرتی تھیں؟ اب اگر حضورؐ نے "لیس علیک بأس" فرمایا تو ظاہر ہے کہ یہ ان کی اس مجبوری کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ ان کے پاس کوئی کپڑا سر اور پاؤں ایک ساتھ ڈھانکنے کے قابل نہ تھا۔ اس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ سر اور پاؤں عورت مغلظہ میں سے نہیں بلکہ مخففہ میں سے ہیں، جن کو بضرورت یا بحالت مجبوری محارم کے سامنے کھولنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن ضرورت اور مجبوری رفع ہو جانے کے بعد انہیں ڈھانکنا چاہیے۔

رِجْلَیْنِ (پاؤں)، کے بارے میں بھی میں عرض کروں گا کہ یہ لفظ قَدَمَین (ٹخنوں کے نیچے پاؤں کے حصے) سے وسیع تر ہے۔ جہاں تک قدمین کا تعلق ہے، وہ عورت نہیں ہیں جیسا کہ حد عورۃ المرأۃ فی الصلوٰۃ (نماز میں ستر کی حد) کے احکام سے ثابت ہے لیکن پاؤں کا وہ حصہ جو قدمین سے اوپر ہے، وہ حدودِ عورت میں داخل ہے اور اسے کسی حد تک صرف ضرورت یا مجبوری کی حالت میں ہی کھولا جا سکتا ہے۔

دوسری حدیث انہوں نے فتح الباری کے حوالہ سے ابن حبان وغیرہ کی یہ نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ کے بیان کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے اور حضرت فاطمہ کے پاس اس حالت میں داخل ہوئے کہ "ہمارے اوپر ایک چادر تھی، جب ہم اسے لمبائی میں پہنتے تو اس سے ہمارے پہلو نکل جاتے اور جب اسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چوڑائی میں پہنتے تو اس سے ہمارے پاؤں اور سر نکل جاتے "

اس روایت کے متعلق نہ تو استاذ فاضل نے اپنے قاعدے کے مطابق اس امر پہ کلام کیا ہے کہ اس میں ضعف کا تو کوئی پہلو نہیں ہے، اور نہ اس بات کی طرف توجہ کی کہ یہ حالت بھی پہلی حدیث کی طرح مجبوری کی حالت تھی جس کو حضرت علیؓ نے خود واضح فرما دیا ہے۔

تیسری حدیث جو انہوں نے نقل فرمائی ہے، اس میں صرف یہ ہے کہ حضرت عائشہ کے رضاعی چچا ان کے ہاں آئے اور انہوں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، مگر انہوں نے اجازت نہ دی۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے فرمایا " انہ عمك فاذنی لہ " یہ تمہارے چچا ہیں، انہیں اجازت دو" لیکن استاذ نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ عورت کے حدودِ ستر کے مسئلے سے اس حدیث کا کیا تعلق ہے؟ میں خود اس کا تعلق نہیں سمجھ سکا اور نہ مجھے امید ہے کہ ناظرین میں سے کوئی اس کو سمجھ سکا ہوگا۔ ممکن ہے کہ استاذ کی توضیح سے یہ سمجھ میں آجائے۔

چوتھی حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کے داخلِ اسلام ہونے کے وقت کی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک روز جب اپنی والدہ کے پاس گئے تو وہ دروازہ بند کیے نہا رہی تھیں۔ فارغ ہو کر انہوں نے جلدی سے دروازہ کھولا " وقد لبست درعھا وعجلت عن خمارھا فقالت انی اشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ " انہوں نے جلدی میں قمیص تو پہن لی مگر دوپٹہ نہ اوڑھ سکیں۔ غسل خانہ سے نکلتے ہی انہوں نے کہا میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں "۔ — استاذ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ سر ڈھانکے بغیر بیٹے کے سامنے آگئیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شرعاً سر ڈھانکنا محارم کے سامنے ضروری نہیں ہے۔ مگر مجھے سخت تعجب ہے کہ حضرت عائشہ کے فعل کو تو فاضل استاذ نے حدیث موقوف کہہ کر اس کا وزن کم کرنے کی کوشش فرمائی، لیکن یہاں وہ حضرت ابوہریرہ کی والدہ کے فعل سے استدلال فرما رہے ہیں، اور فعل بھی عین اس وقت کا جبکہ وہ پہلی مرتبہ داخلِ اسلام ہوئیں۔ گویا استاذ کے نزدیک داخلِ اسلام ہوتے ہی حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ تو تمام حدودِ شریعت سے واقف اور پوری فقیہ ہو گئی تھیں حتیٰ کہ احکامِ شریعت معلوم کرنے کے لیے ان کے اس وقت کے فعل کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، البتہ اگر دلیل نہیں ہے تو حضرت عائشہ اور عہدِ نبوی کی مہاجر خواتین کے عمل میں!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاہم اس پہلو کو نظرانداز کر کے اگر نفسِ مسئلہ کو دیکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس روایت سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ بس یہ ہے کہ ماں کا اپنے بیٹے کے سامنے ننگے سر آنا جائز ہے۔ اور یہی بات ابن سعد کی اُس روایت سے نکلتی ہے جو استاذ نے پانچویں نمبر پر نقل کی ہے کہ "امام محمد بن حنفیہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ اپنی والدہ کو پنکھا کیا کرتے تھے اور ان کی کنگھی کیا کرتے تھے" لیکن ماں اور بیٹے کے تعلق کی نوعیت دوسروں سے جس قدر مختلف ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صحابہ اور تابعین اور ائمہ سلف میں سے کسی کے متعلق بھی یہ بات ہمارے علم میں نہیں آئی ہے کہ باپ نے جوان بیٹی کی یا بھائی نے جوان بہن کی کنگھی چوٹی کی ہو۔ البتہ بیٹوں کے پیسے بوڑھی ماؤں کی ایسی خدمت کرنے کے نظائر مل سکتے ہیں۔ اسی طرح اُس زمانے کی خواتین باپوں اور بھائیوں اور دوسرے محارم کے سامنے تو ہر وقت ننگے سر نہ رہا کرتی تھیں، اگر سر کھولتی تھیں تو بضرورت یا مجبوری البتہ بیٹوں کے سامنے ماؤں کا سر کھلا رہنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا جاتا تھا، کیونکہ سر عورتِ مغلظہ نہیں ہے اور اس کے باب میں وہ سختی نہیں کی گئی ہے جو سینے اور کمر یا پنڈلیوں کے باب میں کی گئی ہے۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں استاذ البانی کو یقین دلاتا ہوں کہ میں بھی غلو اور افراط و تفریط کو اسی طرح غلط سمجھتا ہوں جس طرح وہ سمجھتے ہیں۔ مگر میں یہ جانتا ہوں کہ جو عورتیں اپنے گھر کے مردوں کے سامنے بے حیائی کے لباس پہننے کی عادی ہو جاتی ہیں ان کے لیے باہر بے حیائی کے ساتھ نکلنا اور اجانب کے سامنے اپنے مفاتن کا اظہار کرنا بہت سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جن عورتوں کو خود اپنے گھر میں باپوں اور بھائیوں اور دوسرے محارم کے سامنے حیا کے ساتھ رہنے کی عادت ہوتی ہے ان سے مشکل ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کبھی اجانب کے سامنے بے حیائی کا مظاہرہ کریں گی۔ یہی مصلحت ہے جو مجھے ان احادیث میں نظر آتی ہے جنہیں میں نے "عورتوں کے لیے ستر کے حدود" کے بارے میں نقل کیا ہے۔ میں ان کے مجموعہ کو قابلِ حجت بھی سمجھتا ہوں اور اس حکمت کے مطابق بھی پاتا ہوں جو شارع نے عورتوں کے متعلق اپنے احکام میں ملحوظ رکھی ہے۔

© rasailojaraid.com